از قلم : پروفیسر مرزا محمد منوّر

علّامہ اقبال اور کتابِ زندہ

—— : گزشتہ سے پیوستہ : ——

اسلام، قرآن، رسولؐ، امت، نہ کسی خاص علاقے کے لیے ہیں اور نہ کسی خاص نسل کے لیے، حضورؐ کا ارشاد ہے: "اَلْخَلْقُ عِیَالُ اللّٰہ" (تمام اولادِ آدم اللہ کا کنبہ ہے) سب ایک برادری ہے، پھر اگر برادری سچ مچ برادری ہے تو کوئی کسی سے از روئے قانونِ اسلام بڑا نہیں، کسی کو خصوصی مراعات حاصل نہیں۔ کوئی ساقط الحقوق، کوئی بالائے قانون نہیں اور بقول ریون لیوی

"سربراہِ مملکت بھی قانون کا پابند تھا، اس کے لیے کوئی خصوصی رعایت نہ تھی" [1]

زندگی کے مسائل میں کسی کے لیے قومی، نسلی، اور مالی اعتبار سے یا معاشرے میں منصب اور اختیار کی رو سے کوئی اختصاص نہ تھا، وہ مسائل تجارت سے متعلق تھے، زراعت سے، تعلیم سے، صحتِ عامہ سے، مزدوری سے، خواہ جرم و سزا سے، قانونِ اسلام کے رو برو سب برابر ——

قرآن کو غور و تامل سے پڑھنا اور سمجھنا فقہ کہلاتا ہے اور جو شخص اس ضمن میں صاحبِ فضیلت علم ہو اسے فقیہ کہتے ہیں — اصطلاحاً قرآن و سنّت کی روشنی میں حقوق کا تعین کرنے والا، آئین و دستور مرتب کرنے والا، اور اس بارے میں دوسروں کا بار اٹھانے والا، معلّم اور مفتی اور قاضی سب فقیہہ، اور ایک بات بالکل عیاں ہے کہ فرد کا ذاتی اخلاق اور ایک مخصوص مومنانہ رویّہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک قرآن اور سیرتِ طیبہ صلّی اللہ علیہ وسلم رگ و پے میں نہ اُترے —— حضورؐ کا اپنا اخلاق فعّال اور زندہ قرآن تھا۔ حضرت عائشہ

---

[1] 'SOCIAL STRUCTURE OF ISLAM' ص ۲۹۵

حذیفہ سے پوچھا گیا کہ نبی اکرم ؐ کا اخلاق کیا تھا تو انہوں نے جواب دیا " کَانَ خُلُقُہُ القرآن " (آپؐ کا اخلاق و کردار عین قرآن تھا)۔

علامہ اقبال نے قرآن کو "کتابِ زندہ" اسی وجہ سے قرار دیا ہے کہ وہ آدم کی زندگی پر اثر انداز ہو کر اسے بہتر سے بہتر آدم بناتا چلا جاتا ہے۔ یہ اثر ایک خاص زمانے کے بنو آدم تک محدود نہیں، قرآن کو قیامت تک یہ فریضہ سرانجام دینا ہے۔ لیکن جملہ انقلابات و تحولات، اور تصوّرات اور تغیرات کے باوصف قرآن کو بنیادی اور اصولی راہیں سمجھانا ہیں، لہٰذا قدرتی بات ہے کہ فقہ جس کا اساسی اور اوّلین مصدر قرآن ہے مقفل نہیں ہو سکتی، ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ کسی بھی ارتقائی پیچیدگی یا اضطراب کے عالم میں قرآن سے تعلق توڑ نہیں سکتی۔ حضرتِ علامہ اس باب میں یوں اظہارِ خیال کرتے ہیں :۔

" لیکن اس سلسلے میں غور طلب امر قرآنِ مجید کا وہ مطمحِ نظر ہے جو اس نے زندگی کے بارے میں قائم کیا اور جس میں اس کی نگاہیں جمود کے بجائے حرکت پر ہیں۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ جس کتاب کا مطمحِ نظر ایسا ہو گا، اس کی روش ارتقاء کے خلاف کیسے ہو سکتی ہے؟ البتہ ہمیں نہیں بھولنا چاہیئے تو یہ کہ زندگی محض تغیر ہی نہیں، اس میں حفظ و ثبات کا ایک عنصر بھی موجود ہے۔ بات اصل میں یہ ہے کہ انسان جب اپنی تخلیقی فعالیت سے لطف اندوز ہوتا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ زندگی کے نئے نئے جلووں کا مشاہدہ کرتا ہے تو اپنے انکشافِ ذات سے آپ ہی بے چین ہو جاتا ہے، لہٰذا اس ہر لحظہ آگے ہی آگے بڑھنے والی حرکت میں اپنے ماضی کو نظر انداز نہیں کر سکتا " [1]

حضرتِ علامہ فقہا کی محنت و کاوش کی داد دیتے ہیں کہتے ہیں :۔

" .... جن حضرات نے تاریخِ اسلام کا مطالعہ کیا ہے، خوب جانتے ہیں کہ بلحاظ ایک نظامِ مدنیت اور سیاست، اسلام نے جو کامیابی

---

[1] تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ۔ ص ۲۵۷۔
ایضاً ص ۲۵۹

حاصل کی ہے اس کا تقریباً نصف حصہ ہمارے فقہا کی ذہانت اور فطانت کا مرہونِ منت ہے۔ فان کریمر (VON KREAMER) لکھتا ہے "رومیوں کے بعد عرب ہی وہ قوم ہیں جو اس امر کا دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ان کے پاس اپنا ایک مخصوص اور بڑی خوبی اور محنت سے تیار کیا ہوا قانون موجود ہے۔"

مگر فقہائے ماضی کو اس طرح داد دینے کے باوصف وہ یہ ماننے کو بالکل تیار نہیں کہ اب فقہ میں مزید ترقی ممکن نہیں، چنانچہ سطورِ داد و تحسین کے ساتھ ہی کہتے ہیں:-

"لیکن اس ساری جامعیت اور ہمہ گیری کے باوجود ہمارے نظاماتِ فقہ بالآخر افراد ہی کی ذاتی تعبیرات کا نتیجہ ہیں اور اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان پر قانون کے نشوونما کا خاتمہ ہو چکا ہے۔"

پھر اسی ضمن میں چند سطور آگے چل کے فرمایا۔

"ائمہ مذاہب کا کیا یہی دعویٰ تھا کہ ان کے استدلال اور تعبیرات حرفِ آخر ہیں؟ ہرگز نہیں ـــ اندریں صورت مسلمانوں کا آزاد خیال طبقہ اگر اس امر کا دعویٰ دار ہے کہ اسے اپنے تجربات، زندگی کے بدلتے ہوئے احوال و ظروف کے پیشِ نظر فقہ و قانون کے بنیادی اصولوں کی از سرِ نو تعبیر کا حق پہنچتا ہے تو میرے نزدیک یہ کوئی ایسی بات نہیں جو غلط ہو۔ قرآنِ پاک کا یہ ارشاد کہ زندگی ایک مسلسل تخلیقی عمل ہے بجائے خود اس امر کا مقتضی ہے کہ مسلمانوں کی ہر نسل اسلاف کی رہنمائی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے مسائل آپ حل کرے، یہ نہیں کہ اپنے لیے روک تصور کرے۔" [1]

بہرحال فقہی مسائل کا زیادہ تر تعلق معاشرے سے ہے بلکہ معاشروں سے، دنیا روز بروز زمانی اعتبار سے سکڑ رہی ہے لہٰذا امکانی بُعد بھی کم ہو رہا ہے۔ دنیا کوئی معاشرہ دوسرے معاشروں سے الگ تھلگ نہیں رہ گیا اور نہ رہ سکتا ہے

[1] تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ ص ۲۹

بالفاظِ دیگر یہ کہ فقہِ اسلامی کا دائرہ وہاں وہاں تک اثر انداز ہونا چاہیئے جہاں جہاں مسلمان کسی بھی حیثیت واثر کا مالک ہے۔ اس لیے کہ اب تجارت و تعلیم، صلح و جنگ، حریف و حلیف وغیرہ کی نوعیت کچھ سے کچھ ہوتی جارہی ہے۔ لمبے سفر میں جو کسی اور جگہ کے وقت سے شروع ہوتا ہے اور کسی اور جگہ کے وقت پر ختم ہوتا ہے، راستے میں طلوع و غروب کے وہ اوقات نہیں رہتے۔ مثلاً روزے دار اپنے گھر سے چلتا ہے۔ اپنے مقامی وقت کے حساب اور سورج کی ایک مخصوص منزل کے عالم میں، مگر وہاں وہاں پہنچتا ہے جہاں اوقات بھی بدلتے ہیں اور طلوع و غروب کی منزلیں بھی کچھ کا کچھ منظر دکھاتی ہیں۔ لہٰذا کوئی صورت وقت اور گھنٹوں کے اوسط سے مقرر ہونی چاہیئے۔ جیسے ایسے علاقوں میں ہوگا جہاں راتیں کئی کئی دنوں بلکہ ہفتوں کی ہیں۔ یہ تو محض ایک ننھی سی مثال تھی۔ غرض یہ کہ بڑھتی ہوئی بین الاقوامیت اور سکڑتی ہوئی کائنات میں پیچیدہ تر صورت اختیار کرنے والے معاملات و مسائل کا مقابلہ کرنے کے لیے اہلِ نظر فقہا کو تیار رہنا چاہیئے۔ حضرت علامہ کے آرا اوپر بیان ہو چکے ہیں۔ ان کا ایمان یہ ہے کہ قرآن مصدرِ اوّل کی حیثیت سے پیشِ نظر رکھنے اور چراغ سنت کی روشنی میں دیکھنے اور قیاس کے وسیع اور جرأت بخش جوہر کا سہارا لینے سے ہر نئے مسئلے کا حل تلاش کیا جا سکتا ہے۔ اگر یہ نہیں تو پھر قیاس کا معنی ہی کیا ہے؟

حضرت معاذ بن جبل رضؓ کو جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن کی حکومت سپرد فرمائی تو استفسار فرمایا کہ تم امور و معاملات کے فیصلے کیونکر کرو گے؟ عرض کیا، قرآن کی روشنی میں، پھر استفسار ہوا اگر قرآن میں اپنا مطلب نہ پاؤ تو؟ عرض کیا آپ کے عمل سے مدد لوں گا، فرمایا اگر میرے عمل میں بھی وہ معاملہ نہ ملے؟ عرض کیا پھر اپنی دانست سے کام لوں گا۔ اس جواب پر حضور نبی خاتم صلی اللہ علیہ وسلم نے اظہارِ اطمینان و خوشنودی فرمایا۔

واضح رہے کہ فقہ کا اثر بیشتر ان معاملات پر پڑتا ہے جن کا تعلق معاشرے سے ہے۔ انسان معاشرے کا ایک فرد ہے۔ معاشرتی اور اجتماعی زندگی سے ہٹ کر اور کٹ کر کچھ بھی نہیں رہ جاتا۔ اس لیے اس کی اپنی روش بھی معاشرے کے مطابق اثر پذیر اور اثر انداز ہوتی ہے۔ تاہم اس کی اپنی ذات کی بھی ایک "فقہ" ہے۔ وہ اس کی ذاتی، روحانی، اور عملی فقہ ہے جسے ہم اخلاق کہتے ہیں۔ معاشرتی اور انفرادی

اخلاق کے مابین حدِ فاصل بظاہر کوئی نہیں اس لیے کہ فرد اگر اکیلا ہے تو اسے اخلاق کی ضرورت ہی نہیں۔ اخلاق کی گنجائش ہی وہاں نمودار ہوتی ہے جہاں فرد کا دوسرے افراد سے رابطہ اور معاملہ شروع ہوتا ہے، جہاں فرد کو اپنے اور دوسرے کے حقوق و فرائض سے واسطہ پڑتا ہے۔ اس کی جواب دہی دو جگہ ہوتی ہے۔ ایک معاشرے میں مروّج قانون کی عدالت میں اور دوسرے اللہ کے حضور میں، اس کے قانونی جرائم بھی اکثر و بیشتر یہاں گناہ قرار پاتے ہیں۔ اس لیے کہ اسلامی قانون قرآن اور سنّت ہی پر مبنی ہے۔ گویا ہر عدالتی، انتظامی اور تجارتی و معاشی ضابطہ و قاعدہ جس اساس پر استوار ہے وہ دین ہے، یہی باعث ہے کہ دینی اور قانونی امور میں بڑا قریبی رشتہ ہے [1]

ایک شخص جان بوجھ کر ٹریفک کے ضوابط کی خلاف ورزی کرتا ہے اور جرمانے یا قید کی سزا بھگتتا ہے۔ اگر وہ مسلمان ہے تو اسے معلوم ہونا چاہیئے کہ اس نے جان بوجھ کر قانون کی جو خلاف ورزی کی ہے تو گویا دوسروں کی پریشانی، اذیت یا کم از کم گمراہی کا باعث بنا ہے۔ یہ عمل خدا کی عدالت میں گناہ ہے، خواہ اس کا درجہ کتنا ہی کمتر ہو۔ مومن کی عدالت ایک نہیں ہوتی، جواب دہی بھی ایک نہیں ہوتی۔ اس کا ظاہری اخلاق صحیح معنوں میں اخلاق جبھی بنتا ہے جب اس کا باطنی اخلاق بھی صحیح ہو۔ بقول حضرت ابوسعید الخراز "كُلُّ بَاطِنٍ يُخَالِفُهُ ظَاهِرٌ فَهُوَ بَاطِلٌ" [2] (جس باطن کا ظاہر اس کی مخالفت کرے وہ باطن باطل ہے) ظاہری اور باطنی ہم آہنگی کے بغیر انسان بہ طیب خاطر بھلا اور اچھا آدمی نہیں بن سکتا۔ بھلائی اس کا مزاج اور طبیعت قرار نہیں پاتی۔ اس کا جرائم اور گناہوں کے ارتکاب سے اجتناب محض قانون کی گرفت کا خوف ہے۔ خدا کی خوشنودی اور ضمیر و قلب کا اطمینان ہرگز مقصود نہیں لہٰذا ایسا شخص ہمیشہ محفوظ مواقع کی تلاش میں رہتا ہے۔ اور پھر مواقع محفوظ میسر آجائیں تو چوکتا بھی نہیں ــــ "مصنوعی عفت و عظمت کا پیراہن مقاماتِ ہوس کی کشش کے حضور میں ستر و حجاب ثابت نہیں ہو گا۔ یہ پیراہن بڑی آسانی سے تار تار ہو کر اتر جاتا ہے۔ لہٰذا اخلاق کی اصل اور اساس روح کی پاکیزگی ہے جس کا ساف

---

[1] HAR GIBB . MOHAMMADANISM (O.U.P 1961)

[2] عوارف المعارف، عبدالقاہر بن عبداللہ ص ۵۰ -

مطلب یہ ہے کہ اسلام کسی پرائیویٹ اور پبلک لائف کے امتیاز و تفاوت کا قائل نہیں۔
کتب حدیث میں آیا ہے کہ حضور سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

انی بعثت لاتمم مکارم الاخلاق [1]

"میں بہترین اخلاق کی تکمیل کے لیے مبعوث کیا گیا ہوں۔"

جس کا مطلب یہ ہوا کہ اسلام کی روح اخلاقی تربیت و تعلیم ہے اور آدمی کو بہر معنی بہتر سے بہتر آدمی بنانا ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رض کا قول پہلے گذر چکا ہے جس میں انہوں نے فرمایا تھا کہ حضورؐ کا اخلاق سر بسر قرآن تھا" کان خلقہ القرآن" اب بات یوں بنی کہ مسلمان کے لیے بہترین نمونہ حضورؐ کا اسوۂ حسنہ ہے۔ اور حضورؐ کا اسوۂ حسنہ قرآن کے آئینے میں جھلک رہا ہے، گویا مومن جوں جوں حضورؐ کا زیادہ اتباع کرتا ہے، توں توں وہ قرآن بنتا چلا جاتا ہے۔ اگر وہ قرآنی اخلاق سے محروم ہو تو بظاہر وہ کچھ بھی ہو اس کے ضمیر و بطون کے باب میں اطمینان بالعموم ناممکن ہو گا۔ بقول حضرت علامہ ؎

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان!
قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے دنیا میں بھی میزان قیامت میں بھی میزان

یہ تو ظاہر و عیاں ہے کہ قرآن کسی خاص قوم یا نسل یا علاقے کے لیے نہیں آیا، لہٰذا قرآنی اخلاق اور قرآنی آدابِ تربیت بھی بین الانسانی ہیں، اور اس کا مقصود انسان کی انفرادی اور اجتماعی بھلائی ہے۔ چنانچہ ہر وہ علم، ہر وہ رسم، ہر وہ مسلک جو انسان کی بہتری کا باعث بنے وہ سب خیر ہے اور وہ سب اسلام ہے، مگر کسوٹی اور میزان پھر قرآن اور سنت ہوں گے، ایک اخلاق وہ ہے جو معاشرے کی مصلحت کہا جاتا ہے۔ اگر وہ قرآن کے واضح ارشادات بلکہ قرآنی تعلیمات کی روح سے ٹکراتا ہے تو وہ کوئی مصلحت نہیں۔ اس میں لازماً کوئی مضرت پوشیدہ ہے مصلحت کسی نفع عاجل کا باعث ہو سکتی ہے یا دکھائی دے سکتی ہے مگر یقیناً آگے چل کے کسی بڑے اور پائیدار نقصان کا باعث بن سکتی ہے۔ لہٰذا ہر مزعومہ مصلحت کو بھی قرآن ہی کی روشنی میں دیکھنا ہو گا [2] (جاری ہے)

---

[1] "فیض القدیر" (مکتبہ مصطفیٰ البابی، مصر) ص ۱۱۵ جلد دوم۔

[2] حقائق الاسلام و اباطیل خصومہ، از عباس محمود العقاد (بیروت)، دار الکتاب العربی) ص ۱۳۱